اقبالؒ کا پیغام

محمد سرور

اقبالؒ کی عظیم المرتبت شخصیت کی گہرائیوں اور وسعتوں کو سمیٹنا اور ان کے ہمہ گیر پیغام اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنا بڑا مشکل کام ہے، کہنے کو تو اقبالؒ اُردو اور فارسی کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں، جن کی شاعری کی حدیں بہت دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن اقبالؒ محض ایک شاعر ہی نہیں تھے، اور نہ شاعری کی حیثیت اُن کے نزدیک مقصد کی تھی۔ دراصل شاعری کو انہوں نے ذریعہ بنایا تھا اپنے پیغام کی اشاعت کا، جو وہ اپنی قوم کی زبان اور اپنی قوم کی وساطت سے ساری دنیا کو دینا چاہتے تھے۔

اقبالؒ نے اپنے دل و دماغ کی خداداد نعمتوں اور مطالعہ و محنت سے حاصل کی ہوئی اپنی ساری کی ساری علمی و فکری و ادبی صلاحیتوں کو صرف ایک مقصد کے لئے وقف کر دیا تھا، اور وہ تمام عمر اسی مقصد کی تکمیل میں لگے رہے، اُن کی زندگی کا حاصل اور اصل مقصود بس یہی مقصد تھا، وہ جیتے تھے تو اسی مقصد کے لئے، اور آخر وقت تک اُن کو خیال رہا تو اسی کا۔ اور یہ مقصد تھا اپنی گری ہوئی قوم کو ایک حیات بخش پیغام دینا جو گو عملاً اس قوم تک محدود تھا، لیکن فکراً وہ پیغام پوری انسانیت کے لئے تھا۔ اقبالؒ یہ محسوس کرتے تھے، جیسا کہ انہوں نے "پیامِ مشرق" کے مقدمے میں لکھا ہے:-

"اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم اس وقت نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدّنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے، یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی، جس نے پُرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اُس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"

اقبالؒ نے ایک تو زندگی کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے اس نئے آدم اور اس کی نئی دنیا کا تعارف کرایا،

اور دوسرے اس نے ہر دو کی تعمیر میں ہمیں عملی شرکت کی دعوت دی اور اس کے لئے راہِ عمل تجویز کی، موصوف فرماتے ہیں :۔

"زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللّٰہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم، کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

چنانچہ اقبال نے اسی کلیہ کے پیشِ نظر اپنی نظم و نثر دونوں کے ذریعہ انسانی زندگی کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ اُس کے ذریعہ زندگی کے مادی ماحول میں بھی انقلاب ہو سکے، اور اس طرح نئی دنیا وجود میں آئے، اور اس میں نیا آدم پیدا ہو سکے۔

مختصراً یہ ہے اقبال کے پیغام کی اجمالی حقیقت، اور یہ تھا اُس کا فکری پسِ منظر۔ اقبال نے اپنا یہ پیغام ہر رنگ اور ہر آہنگ میں دیا، کبھی اُس کے لئے اُردو اور فارسی کا شاعرانہ جامہ پہنا، اور کبھی انگریزی زبان میں اس پیغام کو اہلِ نظر تک پہنچانے کی کوشش کی، ان کی گفت گو، ان کی تحریر، ان کی تقریر، ان کی سیاسی سرگرمیاں اور ان کے سیاسی خطبے سب کا حاصل مدعا صرف اسی پیغام کی اشاعت تھی، ان سطور میں اقبال کے اس پیغام کا ایک دھندلا سا خاکہ اور اس کے چند واضح نقوش پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

انسان فنا پذیر نہیں

اس کائنات میں قدرت کا سب سے بڑا شاہ کار انسان ہے، اس کے دم سے قدرت کا یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے اور وہی زندگی کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہے، اس کے لئے زمین اور آسمان کی سب چیزیں مسخر کی گئیں اور اُسے زمین میں خدا کا نائب قرار دیا گیا، لیکن خود اُس کی زندگی کے ثبات کا یہ عالم ہے کہ ابھی ہے اور ابھی نہیں، ایک شعلے کی طرح بھڑکا اور پھر ہوا کے ایک جھونکے سے بجھ گیا، موت آٹھوں پہر اس کی گھات میں رہتی ہے اور ذرا بھی اسے موقع ملتا ہے تو اُسے ہست سے نیست کر دیتی ہے، اور اس کے جسمِ خاکی کا دنیا میں کہیں نام و نشان نہیں رہتا۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر انسانی زندگی اتنی ہی بے ثبات ہے اور اس کی حیثیت پانی کے ایک بلبلے سے

زیادہ نہیں کہ ابھی اُبھرا اور ابھی پیوندِ آب ہوگیا، تو پھر یہ ہنگامہ کیوں اور کس لئے یہ اتنی تگ و دو، اور کیوں صبح و شام کی یہ اس قدر فکر، اگر انسان کے مقدر میں زندگی کے یہی چند روز و شب لکھے ہیں اور اُسے دیر یا سویر موت کے ہاتھوں مٹنا ہی ہے تو بہتر ہے کہ کش مکشِ حیات میں اس قدر سرگرداں نہ ہوا جائے اور آدمی زندگی کے دریا کو جہازِ عمرِ رواں میں بے اختیار بیٹھ کر قطع کرلے۔

یہ انسانی زندگی کا سب سے بنیادی مسئلہ ہے اور اس پر افراد و اقوام کے تمام فکر و عمل کا انحصار ہوتا ہے اقبالؔ کے پیام کا اساسی مسئلہ بھی یہی ہے اور اُس نے اسی پر اپنے تمام فلسفے کی عمارت کھڑی کی ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک انسان کا فنا پذیر یا غیر فنا پذیر ہونا ایسا اہم مسئلہ ہے کہ اس کے صحیح حل ہی پر افراد اور اقوام کی زندگی کا دار و مدار رہا ہے۔

انسانی "انا" کو عمل دوام بخشتا ہے

اقبالؔ نے اپنی تصنیفات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا یہ مرکزی نقطہ یعنی "انا" یا "میں" یا اُس کی "خودی" فنا پذیر نہیں، بشرطیکہ وہ عمل سے اپنے آپ کو لازوال بنالے، عمل سے خودی کو نہ صرف اس دنیا میں ثبات اور استحکام ہوتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی جب کہ وہ نتیجہ ہو کسی اعلیٰ مقصد اور بلند نصب العین کا، چناں چہ عملِ صالح اعلیٰ مقصد کا ممنونِ احسان ہوتا ہے، اور اعلیٰ مقصد ہی انسان کو مفید اور ممد حیات عمل کی طرف رہ نمائی کرتا ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک انسان کی زندگی کا ایک بہت بڑا مقصد یہ ہے جو کہ باعث بنتا ہے اس کے عملِ صالح کا، کہ وہ اپنے گرد و پیش کی دنیا کا علم حاصل کرے اور اس کی تسخیر کے لئے مصروفِ عمل ہو، اقبالؔ کے خیال میں آدم کی تخلیق کا مقصد ہی اصل میں یہی علمِ کائنات اور تسخیرِ کائنات ہے۔ اس کے لئے اُسے ہر لحظہ اور ہر لمحہ اپنے گرد و پیش کی دنیا سے نبرد آزما ہونا چاہیئے۔ اس سے اس کی زندگی میں حرارت، شوق اور جذبۂ نمو پیدا ہوگا، اُس کی خوابیدہ صلاحیتیں جاگیں گی۔ فرماتے ہیں:-

> "حیات دراصل ایک ترقی کرنے اور کائنات کو اپنے اندر جذب کرنے والی حرکت کا نام ہے جو رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہوتی ہیں، وہ ان پر غلبہ پاکر آگے بڑھتی ہے، حیات کا خاصہ یا جوہرِ طبعی یہ ہے کہ وہ مسلسل نئی نئی آرزوئیں پیدا کرتی رہتی ہے۔"

بقولِ اقبالؔ کے انسان اس طرح تسخیرِ کائنات کرکے اور اپنی خداداد قوتوں کو جلا دے کر اس دنیا میں خدا

کا نائب ہو سکتا ہے اور اُن کے نزدیک انسان کا مقدر یہی ہے کہ وہ اِس دنیا میں خدا کا نائب بنے اور اُسے پیدا ہی دراصل اسی لئے کیا گیا ہے اور یہی انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے، اور اسی کے لئے اسے سرگرم کار ہونا چاہیئے۔

عمل سے مراد "عمل صالح" ہے

بے شک عمل سے انسان کو دوام نصیب ہوتا ہے لیکن عمل سے کیا مراد ہے؟ کیا بغیر کسی معین مقصد کے کچھ کرتے رہنا عمل ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک وہ عمل جو خودی کو مستحکم کرتا اور انسانی "انا" کو لازوال بناتا ہے، وہ صرف صالح عمل ہے اور صالح عمل وہ ہے جو با مقصد ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ بامقصد عمل کی کیا نوعیت ہے؟ اور مقصد کی تعریف کیا ہے؟ ہمیں اقبالؔ کے انفرادی اور اجتماعی فلسفۂ اخلاق اور اُن کے مابعد الطبیعاتی تصوّرِ حیات میں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک بامقصد عمل یا عمل صالح وہ ہے جو ممدِّ حیات ہو، اور ممدِّ حیات عمل وہ ہے جو صرف تن کو قوت نہ بخشے، بلکہ تن کے اندر جو جان ہے، وہ عمل اس کے لئے بھی باعثِ نمو ہو، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے مفید ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک عمل فرد کے لئے تقویت اور افزائش کا باعث ہو، لیکن فرد کی یہ تقویت اور افزائش اس وقت تک بے معنی رہتی ہے، جب تک کہ اُس سے پوری جماعت کو بھی تقویت نہ ملے، چناں چہ عمل صالح کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس سے فرد کے ساتھ ساتھ جماعت کو بھی قوت اور نمو حاصل ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ فرد اپنے آپ کو کسی انسانی اجتماع کے ساتھ وابستہ کرے۔ بغیر اس کے اس کی زندگی کے کوئی معنی نہیں، اور اس کا کوئی عمل بھی صالح یا ممدِ حیات نہیں ہو سکتا ؎

فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبالؔ کے نزدیک عمل صالح کے لئے ضروری ہے کہ اُس سے جہاں ایک طرف فرد کی زندگی میں استحکام پیدا ہو، وہاں دوسری طرف اس سے قومی وجود کی بھی تربیت ہو سکے، اور اُسے بھی نمو ملے، اس لئے عمل صالح کی شرط یہ ہے:۔

- افراد کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں، تاکہ انفرادی اعمال

کا تباین و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے :

فرد، جماعت اور انسانیت

اقبالؔ انفرادی "انا" کی حفاظت اور اس کے استحکام پر بہت زور دیتے ہیں، بلکہ ایک لحاظ سے اُن کی ساری شاعری اسی دعوت کی صدائے بازگشت ہے۔ اس طرح جب افراد کے مختلف "انا" مل کر قومی "انا" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، تو اقبالؔ اس کے استحکام اور ترقی کو بھی کچھ کم اہمیت نہیں دیتے۔

لیکن آخر یہ قوم بھی تو کُل نوعِ انسانی کا ایک حصہ ہی ہے، اور جس طرح اگر فرد اور قوم کے اغراض و مقاصد میں تناقض ہو، تو اس سے قومی زندگی ناقص رہتی ہے۔ اسی طرح اگر قوم اور پوری نوعِ انسانی میں ہم آہنگی اور مطابقت نہیں، تو ظاہر ہے قومی زندگی مجموعی حیثیت سے ہموار اور متوازن نہیں ہوگی، اور اس کی وجہ سے نہ فرد کی صحیح تربیت ہو سکے گی، نہ قومی "انا" ہی صحت مندانہ طریقے سے نشو و نما پا سکے گا، چنانچہ اقبالؔ پوری انسانیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایسے اصول و مبادی کی طرف بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جن سے ایک قوم کا عمل صالح مجموعی انسانیت کے عمل صالح سے متعارض نہیں ہوتا اور جیسے فرد کا عمل قوم کے لئے ممدِ حیات بنتا ہے، اسی طرح قوم کا عمل تمام انسانیت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہوتا ہے۔

فرد، جماعت اور انسانیت — ہماری زندگی کے یہ تین مدارج ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے اثبات، استحکام اور توسیع کا انحصار دوسرے پر ہے۔ اور عمل صالح وہی ہے جو ان تینوں کے لئے بالترتیب ممد و مفید ہو، اور اُن میں تناقض و تباین کے بجائے ربط و ہم آہنگی پیدا کرے، اسی عمل صالح سے فرد کی خودی مضبوط ہوتی ہے، یہی قومی خودی کو مستحکم کرتا ہے، اور اسی کا حاصل نوعِ انسانی کی ترقی ہے۔

تصورِ الٰہیات

لیکن زندگی کی آخری حد انسانیت پر تو ختم نہیں ہو جاتی، کائنات کی لامحدود وسعتوں میں انسانیت کی مثال دریا میں ایک قطرے کی سمجھئے۔ اقبالؔ کا تصورِ حیات مادی فلسفیوں کی طرح انسانیت تک آ کر رُک نہیں جاتا۔ وہ بحرِ زندگی کو بے کنار مانتے ہیں۔ اور اُن کے نزدیک نہ اس کی کوئی ابتدا ہے، اور نہ انتہا، اور اُس کی کیفیت یہ ہے ؎

ازل اس کے پیچھے ازل سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

کائنات کا یہی سب سے دقیق راز ہے۔ اور اُسے عقلِ انسانی حل کرنے سے قطعاً قاصر ہے۔ یہاں اقبال کا تصوّرِ الہیات خدائے حیّ و قیوم کو اصل حیات مان کر کائنات کے اس معمّے کو حل کرتا ہے؛ اور اس طرح ایک فرد سے لے کر زندگی کی آخری منزل تک انسانی ذہن و عمل کو جن مراحل سے گزرنا ضروری ہے، اور اُسے لامحالہ اُن میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اقبال ہمیں ان میں شمعِ ہدایت دکھاتا ہے، اور اُن کے لئے راہِ عمل تجویز کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ کس طرح فرد اپنی محدود زندگی کو خالقِ زندگی کی طرح ابدی اور لازوال بنا سکتا ہے۔

یہ ہے اقبال کا تصوّرِ الہیات، اور اسی پر اُس کے اجتماعی فلسفے کا انحصار ہے۔ اور اسی بنا پر اُس کے نزدیک ایک فرد کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ "لاہوتی" بن جائے، اور اس میں خدائی اوصاف پیدا ہوں۔ جیسا کہ اوپر کہہ آئے ہیں، زندگی عمل سے بنتی ہے، اور عمل کے لئے مقاصد کا متعین کرنا ضروری ہے۔ اور مقاصد کے تعین ہی سے انسان کے اندر ولولۂ عمل پیدا ہوتا ہے، اور وہ کچھ کر گزرنے پر تُل جاتا ہے۔ لیکن انسان کا عمل، عملِ صالح اُس وقت ہوتا ہے ؎

بہ آں ملّت سرِ دکارے ندارد
کہ دہقانش برائے دیگراں کشت

اس لئے اُس کا پیغام یہ ہے ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!

لا الٰہ الا اللہ

اشتراکیت نے "لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ" کا نعرہ لگایا، اور خالص مادی قدروں پر انسانی زندگی کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کی ٹھانی۔ مارکس نے کہا کہ مذہب افیون ہے، اور لینن نے زبردستی انسانوں کی اس افیون خوردگی کی عادت کو ختم کرنے کا تہیہ کیا۔

اقبال نے جہاں ایک طرف اشتراکیت کے اس "لا سلاطین، لا کلیسا اور لا الٰہ" کے نعرے کا خیر مقدم کیا، اور اُسے "کارِ خداوندان" قرار دیا، اور فرمایا کہ ایک زمانے میں مسلمانوں نے بھی تاریخ

میں یہی فریضہ سرانجام دیا تھا۔ دوسری طرف اس نے یہ بھی کہا کہ زندگی میں محض "لا سلاطین، لا کلیسا، لا الٰہ" سے کام نہیں چلتا، جیسے تعمیر سے پہلے ہر بنائے کہنہ کو ویران کرنا پڑتا ہے، اور اس کے بعد نئی بنیادوں پر نئی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، اسی طرح زندگی میں بے شک اس لا کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ فکر و عمل کی دنیا میں پہلے جولات دہبل بن چکے ہوں، اُن کو توڑا جا سکے، اور نئے افکار و خیالات پر زندگی کی عمارت تعمیر کی جائے۔

زندگی میں لا کے ساتھ الّا کی لزومیت پر اقبال نے اپنے اشعار میں بہت زور دیا ہے، وہ بار بار فرماتے ہیں کہ لا ہی سے دراصل انسانی زندگی میں حرکتِ عمل شروع ہوتی ہے، انسان اسی جذبے سے متاثر ہو کر کچھ نہ کچھ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، لا اُسے ماضی کے بندھنوں سے آزاد کرنا اور اُسے انکار کرنا سکھاتا ہے، جس سے نئی زندگی پیدا ہوتی ہے، اور انسانی فکر آگے بڑھتا ہے۔

لا کی تعریف میں ارشاد ہوتا ہے:۔

در جہاں آغازِ کار از حرف لاست　　　این نخستیں منزلِ مردِ خداست
ملتے کز سوزِ او یک دم تپید　　　از گلِ خود خویش را باز آفرید
پیشِ غیر اللہ لا گفتن حیات　　　تازہ از ہنگامۂ او کائنات
تا نہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست　　　بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

یعنی ــ جہاں میں آغاز کار اسی لا سے ہے اور مرد خدا کی پہلی منزل بھی یہی لا ہے، اور جب تک لا کی رمز سے آدمی آشنا نہ ہو۔ اس کے لئے غیر اللہ کے شکنجے سے نکلنا ناممکن ہے۔

پیامِ مشرق میں ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

چہ خوش بودے اگر مرد نکوے　　　ز بندِ پاستاں آزاد رفتے
اگر تقلید بودے شیوۂ خوب　　　پیمبر ہم رہِ اجداد رفتے

اور یہ پہلوں کے بند سے آزاد ہونا، اور تقلید کے خلاف اُٹھنا ہی اسی لا کا کرشمہ ہے، اور یہ لا ہی ہے جو ہر موجود کو ختم کر کے نئے وجود کو اُبھرنے کا سامان بہم کرتا ہے ؎

ضربِ اُو ہر بود را سازد نبود　　　تا بروں آئی ز گردابِ وجود

لا کی اس تمام مدح سرائی کے ساتھ ساتھ اقبال کا یہ کہنا ہے کہ جب تک لا کے ساتھ الّا نہ ہو،

زندگی کی عمارت کسی محکم اساس پر نہیں ہو سکتی، لا محض تخریب ہے اور بس، یہ ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے ساتھ لڑا سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان میں عمل کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لا انسان کو دعوت دیتا ہے کہ وہ ہر قبائے کہنہ کو چاک چاک کردے، اور قیصر و کسریٰ اس کے ہاتھ سے اپنے انجام کو پہنچے، اسی لا کا ماحصل ہے روسی انقلاب، جس نے نہ زاروں کو چھوڑا، نہ کلیساؤں کو، اور نہ جاگیرداروں کو

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بہ جنگ

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرف لا آمد بروں

آں نظامِ کہنہ را برہم زداست — تیز نیشے بر رگِ عالم زداست

لیکن انسانی عمل لا تک محدود رہے اور الا تک نہ پہنچے تو اس طرح جو نظام بنتا ہے اس میں "آب و نان" کی تو اہمیت ہوتی ہے، لیکن دین کی نہیں، اس سے آدمی عقل کا غلام بن جاتا ہے، اور اغراضِ مادی ہی اس کی زندگی کا نصب العین ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے دین محض لا اِلٰہ نہیں، بلکہ لا الٰہ کے ساتھ الا اللہ بھی ہے۔ یہی دین، دینِ حق ہے، اور یہ کسی زید یا بکر یا کسی مخصوص قوم یا خاص فرقے کی ایجاد نہیں ہوتا۔ اور نہ میری یا آپ کی عقل اس کو وجود دیتی ہے۔ یہ وحی الٰہی کے سرچشمہ سے پھوٹتا ہے۔ اور کائنات کا خالق جو الحیّ یعنی سرتا پا زندگی اور القیوم یعنی زندگی کو برقرار رکھنے والا ہے، اس کو منزل فرماتا ہے، اس دین کا سب سے بڑا وصف بقول اقبالؔ کے۔ یہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر سب کا بھلا ہوتا ہے، اور اس کی نگاہ میں سب انسانوں کی سود و بہبود ہوتی ہے۔ اور پھر لڑائی ہو یا صلح، یہ دونوں میں عدل پر عامل رہنا سکھاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ؎

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عادل اندر صلح و ہم اندر مصاف — وصل و فصلش لا یراعی لا یخاف

یہ تو ہوا دینِ حق، یعنی وہ دین جسے کائنات کا خالق، سب عالموں کا پروردگار اور الحیّ و القیوم نازل فرماتا ہے، اور جو صحیح آئینہ دار ہے۔ لا اِلٰہ اور الا اللہ کا۔

لیکن اگر دینِ حق کسی فرد یا قوم کا آئینِ حیات نہ ہو، اور وہ روسیوں کی طرح محض عقل کی ایجاد کی ہوئی مادی قدروں ہی کو آخری حقیقت سمجھے، تو اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ؎

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود　　　زور در بر ناتواں قاہر شود

اور وہ اس لئے کہ جب تک دینِ حق کے عمومی ضابطۂ اخلاق پر عمل نہ ہو، ہر فرد اور قوم صرف اپنے نفع اور نقصان کو دیکھتی ہے، اور اسی کے مطابق اپنے لئے لائحہ عمل بناتی ہے۔ کیوں کہ

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر　　　سُودِ خود بیند نہ بیند سُودِ غیر

اور جب یہ حالت ہو تو "آمری" "قاہری" بن جاتی ہے، زور در ناتواں کو دباتا ہے، اور اسے اپنی اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس آمریِ کو اقبالؔ کافری کہتا ہے، اور اس کے نزدیک اس وقت روس کا موجودہ آئین یہی "کافری" ہے۔

اقبالؔ کے نزدیک یہ آئین کافری جسے وہ "لا الٰہ" کا نتیجہ قرار دیتا ہے، انسانیت کو صحیح اخوت سے محروم رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان تن کا ہو کر رہ جاتا ہے، اور بجائے اس کے وہ انسانی وحدت اور انسانی مساوات کی بنیاد ہمہ گیر اور عالم گیر اخلاقی قدروں پر رکھے، وہ شکم کو اس کا اساس بناتا ہے۔ اور اس کی بنا، پر ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے خلاف اُبھارتا اور محبت عالم گیر کی جگہ نفرت عالم گیر کو انسانی زندگی کا اساس بناتا ہے۔

اقبالؔ فرماتے ہیں کہ یہ نظام بھی اسی طرح ناقص ہے، جیسے کہ ملوکیت، اس کے ہاتھوں بھی ملوکیت کی طرح بدن تو فربہ ہوتا ہے لیکن سینہ دل سے خالی اور بے نور رہتا ہے اور اس کی مثال اس شہد کی مکھی کی طرح ہے، جو گل پر چرتے وقت پتوں کو چھوڑ دیتی ہے لیکن اس سے شہد لے جاتی ہے، مرحوم کے نزدیک یہ اشتراکیت اور یہ ملوکیت دونوں کی دونوں

ہردو را جاں ناصبور و ناشکیب　　　ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج　　　درمیاں ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دیں و فن آرد شکست　　　آں بُرد جاں را ز تن نان را ز دست

دونوں انسان کو ناصبور و ناشکیب بناتی ہیں۔ دونوں آدم کو فریب دیتی اور خدا کا انکار کرتی ہیں، ایک کے نزدیک زندگی محض بغاوت اور دوسری کے نزدیک صرف جلب مال ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

غرق دیدم ہر دو را در آب و گِل　　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل

میں نے دونوں کو آب و گل میں غرق دیکھا، اور دونوں کا یہ حال ہے کہ ان میں تن تو روشن ہوتا ہے، لیکن

دل تاریک رہتا ہے ـــــــ حالاں کہ زندگی کے لئے جتنا سوختن یعنی لا ضروری ہے، اتنا ساختن یعنی الاّ لابدی ہے۔ چناں چہ ؎

زندگانی سوختن با ساختن　　　　در گلے تخم دلے انداختن

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "سوختن" کے بعد "ساختن" کی منزل نہیں آئے گی، اور کیا لا کے بعد ضروری نہیں کہ روسی اشتراکیت الا اللہ کی طرف گامزن ہونے پر مجبور ہو ـــــــ اقبال نے جمال الدین افغانی کی زبان سے ملت روس کو جو پیغام دیا ہے، اِس میں وہ فرماتے ہیں :-

تو نے کارِ خداوندان تو کر لیا۔ اب تو لا سے الاّ کی طرف قدم بڑھا۔ اگر تجھے حق کی تلاش ہے، تو لا سے گذر جا، تاکہ تو استحکام کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ تو کہ نظامِ عالم کی خواہاں ہے، کیا تو نے اس کے لئے اساسِ محکم ڈھونڈ لیا۔ وہ اساسِ محکم کیا ہے؟ وہ ہے لَا اِلٰہ اِلا اللہ، یہی دینِ حق ہے، اور اسی میں انسانیت کی نجات و فلاح ہے۔

اس کے بعد اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد، اے اقوامِ شرق" میں علامہ اقبال اس اُمید کا اظہار فرماتے ہیں کہ وہ دن دُور نہیں، جب روس کو اس جنون سے نکلنا پڑے ، اور وہ الاّ کے حصار میں داخل ہونے پر مجبور ہو۔ فرماتے ہیں ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں　　　　خویش را زیں تُند باد آرد بروں

کیوں کہ

در مقام لا نیا ساید حیات　　　　سوئے الا می خرامد کائنات

یعنی مقام لا زندگی کے لئے سازگار نہیں ہوتا، اور کائنات مجبور ہے کہ الاّ کی طرف گامزن ہو۔ اور وہ اس لئے کہ ؎

لا و اِلاّ سازو برگِ امتاں　　　　نفی بے اثباتِ مرگِ امتاں

لا و الاّ احتسابِ کائنات　　　　لا و الاّ فتحِ بابِ کائنات

ہر دو تقدیرِ جہاں کاف و نون　　　　حرکت از لا زاید از الاّ سکون

یعنی زندگی میں حرکت لا سے پیدا ہوتی ہے اور سکون الاّ سے، اور جس زندگی میں محض حرکت ہے، سکون نہیں، وہ جنون ہے، اور صرف چند روزہ ، اور جس میں سکون ہے حرکت نہیں، وہ موت ہے، زندگی نہیں۔

اس لئے اگر روس لا سے نہیں نکلتا، تو اس کی تباہی ہے، اور اگر ہم سکون نما جمود کو ترک نہیں کرتے، تو ہمارا پنپنا بھی ناممکن، لیکن اقبالؔ کو امید تھی کہ روس اس لا سے ضرور نکل کر رہے گا، اور اس حقیقت کو جان لے گا۔

کیوں کہ الّا کے بغیر زندگی کا کوئی نظام پائیدار نہیں بن سکتا۔

خودی کا تصوّر

اقبالؔ کے فلسفے کا بنیادی نقطۂ نظر یہ خودی ہے، اُن کے نزدیک خودی کا استحکام زندگی کا اصل الاصول ہے، فرد اگر خودی کو مضبوط نہیں کرتا تو وہ مردہ ہے خواہ وہ سانس ہی کیوں نہ لے رہا ہو، اگر زندگی میں نمو کا ذوق نہ ہو، تو وہ موت ہے۔ اگر فرد اپنی خودی کی تعمیر کرے تو وہ خدائی کرتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خودی کے ارتقا، اور اس کی تکمیل کی کیا صورت ہے؟۔ اقبالؔ فرماتے ہیں کہ خودی ایک مستقل جدوجہد کا نتیجہ ہوتی ہے جو انسان کو اپنے ماحول کے ناسازگار حالات اور اپنی ذات کے غیر ترقی کن رجحانات کے خلاف کرنی پڑتی ہے۔ خود اُن کے الفاظ میں خودی کا وجود اس کش مکش کا رہین منت ہوتا ہے جو فرد ماحول کے خلاف کرتا ہے۔ اس کے لئے ظاہر ہے، ضروری ہے کہ فرد کا اپنے ماحول سے تعلق ہو۔ فرد اور ماحول کے اس باہمی ربط و کش مکش، تاثر و تاثیر اور مخالفت و ہم آہنگی کے دَوران خودی کی تشکیل ہوتی ہے، وہ ترقی کرتی ہے اور اپنے کمال کو پہنچتی ہے۔

اقبالؔ عمل اور حرکت کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں، وہ انسانوں کو خود شناسی کی دعوت دیتے ہیں، اُن کے نزدیک فرد کو بے خطر ہو کر زندگی کی کش مکش میں کودنا چاہیئے، وہ اُسے اپنے تیشے سے اپنا راستہ بنانے کو کہتے ہیں، دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں میں اندھا دھند چلنا گناہ قرار دیتے ہیں، اگر انسان سے کوئی نادر کام ہو جائے تو اس کا گناہ بھی اُن کے نزدیک ثواب ہوتا ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہِ دیگراں رفتن عذاب است
اگر از دست تو کارِ نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است